پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ میں ڈاکٹر فضل الرحمان کی اسلام کے خلاف زہر افشانی

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مدرسہ احیاء العلوم ماموں کانجن
ضلع لائل پور

۲۴ مئی ۱۹۶۶ء سے ۱۱ مئی ۱۹۶۶ء تک امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں ایک مذاکرہ ہوا تھا جس میں دنیا کے تمام مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس مذاکرہ میں ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے گئے۔" (فکر و نظر جلد ۴ ش ۱ ص ۱)

اسی "عالمی مذہبی کانفرنس" میں پاکستان کے مندوب، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے نمائندہ اور اسلام کے وکیل کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب بالقابہ صدرِ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی بھی شریک ہوئے، اس طرح آپ کیلئے اپنے ہم مسلک و ہم مشرب، ہم ذوق و ہمراز اور ہم نوالہ و ہم پیالہ احباب سے شرفِ ملاقات، ہم کلامی اور سات آٹھ دن تک کچھ اپنی کہنے اور کچھ انکی سننے کا زریں موقعہ ہاتھ آیا۔ ذرا تصور کیجئے امریکہ کا آزاد ماحول، پرنسٹن یونیورسٹی کی پرکیف فضا، نہ خطرۂ محتسب، نہ شور و شغبِ ملّا، ہم اور آپ کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ سوز و ساز اور راز و نیاز کی کتنی داستانیں دہرائی گئی ہونگی، اسلام کے کتنے مثالی معیار اور نصب العین طے ہوئے ہونگے، اور ان کو بدلتے ہوئے مظاہر و احوال میں ترقی پسندانہ عملی جامہ پہنانے کیلئے کیا کیا منصوبے زیر غور آئے ہونگے؟[1] "روایتی اسلام" کی تدفین کے لئے کن کن تدابیر پر سوچ بچار۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب کے مکتبِ فکر کے نزدیک اسلام کی تعریف یہ ہے۔ "اسلام نام ہے چند مثالی معیارات اور نصب العینوں کا جن کو مختلف معاشرتی مظاہر و احوال میں ترقی پسندانہ طور پر عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔" (فکر و نظر جلد ۲ ش ۱۱ ص ۷۹۶) یہ تعریف پہلے پہل سرسید خان گروہ بعض اور بعض دوسرے نامور غیر مسلم مستشرقین سے آپ نے حاصل کی ہے۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۱۲ ص ۹۰۹) اور تیرہ چودہ صدیوں کا اسلام ان کی اصطلاح میں "روایتی اسلام" یا راسخ العقیدہ گروہ کا اسلام کہلاتا ہے۔ جو ان کے نزدیک مردہ ہے ۔۔۔۔

ہوتی ہوگی، زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہ تجدد پسندانہ اصلاحِ اسلام کے کیا کیا وسائل و ذرائع زیرِ بحث آئے ہوں گے۔ فارسی شاعر کی زبان میں ؎

آنجا کرا دماغ کہ پرسد زباغباں   بلبل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد

یہ تمام امور ہمارے لئے بہر حال پردۂ غیب میں ہیں۔ البتہ "مدیر فکر و نظر" کا ممنون ہونا چاہئیے کہ کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے انگریزی مقالہ جو اسلام کی طرف سے آپ نے اس موقع پر پیش کیا تھا کے اردو ترجمہ کرنے اور اسکی اشاعت کی زحمت فرمائی، مقالہ کا اردو عنوان ہے۔ "اسلام پر تجدد پسندی کے اثرات" ——— یہ مقالہ ایک دو بار نہیں بلکہ کئی بار ہم نے بھی پڑھا۔ اس کے مضمرات پر غور کیا، اور ڈاکٹر صاحب کی اسلام پر بحث کو خوب جانچا پرکھا، پہلے ہم اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ڈاکٹر صاحب اس موقعہ پر اسلامی ملک کے مندوب، اسلامی ادارہ کے سربراہ اور اسلام کے وکیل کی حیثیت سے تشریف لے جارہے ہیں۔ ان کے نظریات کچھ بھی ہوں لیکن آخر قیامت تو نہیں آگئی وہ اپنی اس پوزیشن کا لحاظ کرتے ہوئے "مذاہب عالم کانفرنس" میں اسلام کی کچھ تو لاج رکھیں گے۔ مگر "عالم اسلام" کی امیدوں کے برعکس آپ نے سب کے سامنے اسلام کی وہ پٹائی کی اور جارحیت کا ایسا شدید مظاہرہ کیا کہ ہمیں اپنی خوش فہمی پر ماتم کئے بغیر اور مدیرِ فکر و نظر کو حکومت اور ادارہ تحقیقات دونوں کی طرف "ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں" کا اعلان کئے بغیر نہ بن پڑی، وہ فرماتے ہیں :-

"یہ مقالہ اسی مذاکرہ میں پڑھا گیا، جن خیالات کا اس میں اظہار کیا گیا ہے وہ فاضل مقالہ نگار کی اپنی تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ حکومتِ پاکستان یا ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کی پالیسی سے ان کا کوئی تعلق نہیں"۔
(فکر و نظر جلد ۴ ش ۱ ص ۹)

ہم تمام عالمِ اسلام بالخصوص مسلمانانِ پاکستان کیطرف سے "فکر و نظر" کے مدیر محترم کے شکر گذار ہیں، کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے سوقیانہ قسم کے مقالہ کی ذمہ داری سے انکار کر دیا، ان کا یہ اقدام مستحقِ صد مبارکباد ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے مکروہ پروپیگنڈہ کی ذمہ داری نہ کوئی اسلامی حکومت اٹھا سکتی ہے، اور نہ کوئی سنجیدہ ادارہ اس بارِ گراں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ یہ اعلان نہ کرتے تو ملک اور بیرونِ ملک کے زخمی دل مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوتی۔

البتہ یہ معمّا ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔ شاید فکر و نظر کے مدیرِ محترم اسے حل کر سکیں۔ کہ ایک شخص کسی حکومت یا ادارہ کا نمائندہ اور سفیر بن کر جائے، لیکن جب وہ فرائضِ سفارت انجام

دے سکے تو حکومت اور ادارہ اپنے نمائندہ کی ذمہ داری سے انکار کر دے، ادارتی اور سفارتی تاریخ میں اسکی کتنی مثالیں ملیں گی ——؟ یہ تو دیکھا سنا تھا، کہ اگر کسی نمائندہ نے حکومت یا ادارے کی پالیسی کا احترام کئے بغیر کوئی بیان جاری کر دیا تو نہ صرف یہ کہ وہ معزول کر دیا جاتا ہے، بلکہ اس کے خلاف مناسب کارروائی بھی عمل میں لائی جاتی ہے۔ مگر ہماری ناقص معلومات میں یہ کبھی نہیں آیا، کہ سفیر عہدۂ سفارت پر، نمائندہ منصبِ نمائندگی پر اور صدر کرسیِ صدارت پر بدستور فائز رہتے ہوئے اپنی حکومت اور ادارہ کی پالیسی سے لاتعلق بیان دیتا رہے۔ اس کے باوجود نہ اسے کسی قسم کی سرزنش کی جائے، نہ اسکی معزولی عمل میں آئے، نہ اسے کسی درجہ میں قابلِ ملامت تصور کیا جائے، بلکہ اس تمام قصہ کو "فاضل مقالہ نگار کی اپنی تحقیق کا نتیجہ" کہہ کر گول کر دیا جائے ——

اور اس معمّا میں ناقابلِ فہم پیچیدگی اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ جب کہ ہم "فکر و نظر" کے "فاضل مقالہ نگار" کے مقالہ میں صدرِ مملکت اور ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کی صاف صاف نمائندگی ان الفاظ میں پڑھتے ہیں :-

"صدر محمد ایوب خان کی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں ایک ادارہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے نام سے علوم اسلامی میں تحقیقات، اور جدید ضرورتوں کے لئے اسلام کی تعبیر و تشریح کی غرض سے قائم کیا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اس ادارہ کو ایک آئینی حیثیت دی گئی صـ۲۶"

"ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے مطالعہ نے بتلایا۔ الخ" "ادارۂ تحقیقات کا استدلال یہ تھا" صـ۲۷

"فاضل مقالہ نگار" کے یہ بیانات کسی وکیل، بیرسٹر اور جج کے سامنے رکھیئے، کیا وہ یہ فیصلہ دے گا، کہ مقالہ نگار صرف اپنے خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔؟ ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ پکار پکار کر اعلان کرتے ہیں، کہ وہ اپنی زبان سے نہیں، بلکہ صدر مملکت اور ادارۂ تحقیقات سلامی کی زبان سے بول رہے ہیں —— ؎

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان اپنی ہے بات اُنکی
ان ہی کی محفل سجا رہا ہوں چراغ اپنا ہے رات اُن کی

پھر اس معمّا کی الجھن میں مزید بر مزید اضافہ اس وقت ہو جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ "زہر آب مقالہ" جو ایک خاص ماحول میں پڑھا گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ اسے دفن کر دیا جاتا، ہوا یہ

ایک طرف " ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی " اس مقالہ کے اردو، عربی، بنگلہ تراجم اپنے مجلات میں ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر پورے پاکستان بلکہ کل عالم اسلام اور دیگر ممالک میں اس شر کو پھیلاتا ہے۔ اور دوسری طرف بڑی معصومیت اور آبلہ فریبی سے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی شائع کرتا ہے :-

" یہ مقالہ نگار کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ ہے، حکومتِ پاکستان یا ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کی پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں "

اگر واقعی ادارۂ تحقیقات کو اس سے کوئی تعلق نہیں، تو مختلف زبانوں میں بڑی آب وتاب کے ساتھ اس کی اشاعت کے کیا معنی ـــــ ؟

ہمیں ادارۂ تحقیقات کی اس پالیسی اور طرزِ عمل سے اندیشہ ہے، کہ جس طرح آج مدیر فکر ونظر" نے اپنے صدرِ محترم کے متعلق اعلان کر دیا، اسی طرح کل ان کے اسی اعلان کے بارے میں ادارہ کے کوئی دوسرے مدیر صاحب یہ اعلان نہ کر دیں کہ :-

" ڈاکٹر صاحب کے مقالہ سے متعلق " مدیر فکر ونظر " نے جو اعلانِ لاتعلقی فرمایا ہے۔ یہ " فاضل مدیر فکر ونظر " کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ حکومتِ پاکستان یا ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کی پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں "

کیا یہاں ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے فکر ونظر کے فاضل مدیر سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ ؟ کہ آپ اپنے ادارہ کی پالیسی کا اعلان بصد شوق کریں۔ لیکن حکومتِ پاکستان کی پالیسی کے اعلان کا منصب انہیں کب سے تفویض ہوا۔ ؟ یہ سوال اس لئے اہمیت رکھتا ہے، کہ اگر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے صدرِ محترم جناب ڈاکٹر فضل الرحمان کا مقالہ " غیر ذمہ دارانہ " ہو سکتا ہے، تو ان کے نائب، مدیر فکر ونظر کے اعلان پر کون اعتماد کرے گا۔ ؟ اگر واقعۃً حکومتِ پاکستان کی پالیسی سے ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات کا کوئی تعلق نہیں تھا، تو حکومتِ پاکستان کی وزارتِ اطلاعات ونشریات یا کسی اور متعلقہ محکمہ کی جانب سے کیوں اس سے بیزاری کا اعلان نہ کیا گیا؟ یا حکومت کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ اس قدر غیر اہم اور لایعنی ہے۔ کہ وہ اس کے بارے میں کسی وضاحتی بیان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی۔ ؟

بہرحال ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ تو ایک معمہ ہے۔ اس پر مدیر فکر ونظر کا اعلان لاتعلقی معمہ در معمہ ہے۔ بایں ہمہ ہم ان کے شکر گذار ہیں۔ کہ اس " غیر ذمہ دارانہ مقالہ " سے لاتعلقی کا

"غیر ذمہ دارانہ اعلان" تو کر ہی دیا — عجب بلا بود سے اگر این ہم نہ بود سے۔

مقالہ سے متعلق ان ابتدائی امور کے بعد اب اس کے مشمولات پر نظر ڈالئے، موصوف اپنی بحث کے حدود متعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"یہاں مجھے جس مسئلے سے بحث کرنا ہے، وہ کافی حد تک محدود اور بسیط ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسلامی دنیا اور دوسری وسیع تر دنیا، دونوں کیلئے بہت زیادہ فوری اہمیت رکھتا ہے، میرا ارادہ تجدید۔ یعنی جدید زمانے کے مطابق اپنے آپ کو کرنے، یا زیادہ واضح الفاظ میں جدت پسندی کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ اور اسلامی دنیا پر جدید طرز زندگی کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے، اس کا ایک مجموعی جائزہ لینا ہے۔ اس سے خود اسلامی دنیا، اور دوسری وسیع تر دنیا کے لئے مستقبل قریب میں مسلم معاشرے میں مناسب حد تک متوقع تبدیلیوں کی نوعیت اور وسعت واضح کرنے میں مدد ملے گی" ص ۱

آپ اس سے سمجھ گئے ہوں گے کہ موصوف، تجدید، تجدد، اپنے کو جدید زمانے کے مطابق ڈھالنے یا واضح الفاظ میں جدت پسندی کے عوامل، اثرات اور تدابیر پر بحث کریں گے۔ یعنی اسلام کو "نئی دنیا" کے مطابق کتنا بدلا جاچکا ہے، کتنا بدلا جاسکتا ہے، کس طرح بدلا جاسکتا ہے، اور یہ بدلنا کیوں ضروری ہے۔ اس اقتباس میں موصوف نے دو جگہ اسلامی دنیا کے ساتھ "دوسری وسیع تر دنیا" کے لئے اس مسئلہ کی "بہت زیادہ فوری اہمیت" کا جو ذکر فرمایا ہے، اسے کسی طرح نظر انداز نہ کیا جائے، موصوف یہ بتلانا چاہتے ہیں، کہ اسلام کی تبدیلی میں اسلامی دنیا کو دلچسپی ہو یا نہ ہو، لیکن "دوسری وسیع تر دنیا" بالخصوص مسیحیت، یہودیت اور چینی اور روسی کمیونزم کے حاملین بڑی بے چینی سے منتظر ہیں، کہ مسلمان اپنے اسلام اور اسلامی ورثہ کو خیرباد کہہ کر لادینیت، سیکولرزم، یا مذہب کی بگڑی ہوئی صورت کو اپنا کر کب ہماری سطح پر آجاتے ہیں، تاکہ مسلمانوں کو یہ کہنے کا موقعہ باقی نہ رہے، کہ اپنی اصلی شکل میں صحیح مذہب اگر کوئی موجود ہے تو وہ اسلام ہے۔

اس حرف آغاز کے بعد موصوف اصلاحی تحریکوں کا تذکرہ شروع کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہابی تحریک اور سنوسی تحریک اور ان جیسی دوسری تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"لیکن انہیں کسی طرح بھی جدت پسند اصلاحی تحریکیں نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ صاف طور پر انکی اصلاحی سرگرمیوں کی حدود تمام کی تمام مسلمانوں کے ماضی کے چوکھٹے میں منحصر ہیں" ص ۱

یعنی جدّت پسندی کے لئے پہلی شرط یہ ہے۔ کہ اسلام کے ماضی سے وہ اپنا رشتہ بالکلیہ کاٹ لے، اور یہ تحریکیں اس شرط سے محروم تھیں۔ اس کے بعد جدت پسندی کے اصل نقطۂ آغاز کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

" دنیائے اسلام میں تجدّد کے عمل دخل کی ابتدا اس وقت ہوئی، جب کہ مغربی طاقتوں کی مسلمان ممالک کے ساتھ فوجی اور سیاسی مڈبھیڑ ہوئی " ص۱۱

اس ذیل وہ شیخ محمد عبدہٗ مصری، اور سر سید احمد خاں کی سائنسی تحریک کا ذکر کرتے ہیں، اور ان دونوں میں مشابہت اور مفارقت کی صورتیں ذکر کرنے کے بعد ان دونوں تحریکوں کے تباہ کن حشر کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد وہ جدّت پسندی کے ایک اور مرحلہ کی نشاندہی کرتے ہیں، جسے ان کی اصطلاح میں علامہ محمد اقبال کا مرحلہ کہا جا سکتا ہے، اس کے بارے میں موصوف کا خیال ہے کہ :-

" اس مرحلے میں مسلمانوں کا معذرت خواہانہ انداز مغرب کے خلاف ایک جارحانہ اقدام کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور ان کی مدافعت، جارحیت میں بدل جاتی ہے۔ مغرب کے خلاف اس طرزِ فکر نے جو کہ صریحاً دو رخاپن کا حامل ہے، قدامت پسندوں اور جدّت پسندوں کی صفوں کو باہم ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا، اتنا قریب کہ بعض دفعہ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے " ص۱۲

موصوف کے نزدیک جدّت پسندی کی یہ تحریک بھی قدامت پسندوں کی نظر ہو کر رہ گئی، ان تمام تحریکات کی ناکامی کا اصل باعث کیا تھا۔؟ اس سلسلہ میں موصوف نے بڑی جرأت مندانہ بات کہی ہے، ان کا یہ "تجرباتی نظریہ" ان کی "اسلامی ذہنیت" کو پوری طرح واشگاف کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

" یہ سوال کہ خالص دنیوی اقلیت اور سائنسی ذہنیت کتنی دور تک اور کتنی گہری قبول ہو سکتی ہے، اگر روایتی مذہبی تصورات و اعمال اس سے نہایت سختی سے الگ رکھے جائیں؟ کافی سوچ میں ڈالنے والا ہے، تجربہ یہ بتلاتا ہے۔ کہ یہ کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ مذہب کو زندگی پر قطعی طور سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کی اجازت نہ دی جائے، لیکن جب تک زندگی پر مذہب اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے تو ایک طرف خالص دنیوی۔ جدید عقلیت اور سائنسی ذہنیت، اور دوسری طرف روایتی مذہبی تصورات و اعمال دونوں کو ایک

دوسرے سے خواہ کتنی ہی سختی سے الگ الگ رکھا جائے ، مذہب دنیوی افکار کو بھی داخل ہونے سے بڑے موثر طریقے سے روکے گا ۔ یہ بات اگرچہ بظاہر متناقض نظر آتی ہے ، لیکن واقعہ یہی ہے " صـ۱۵

خلاصہ یہ کہ موصوف کے نزدیک مسلمانوں کی تمام بیماریوں کی جڑ " مذہب اسلام " ہے۔ اس لئے مسلمان اگر اس بیماری سے شفایاب ہو کر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو راستے کے اس پتھر کو ہٹائیں ، مذہب اسلام کو زندگی سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے پر مجبور کریں ، بس مسلمان جسقدر مذہب سے دور اور لامذہبیت کے قریب ہوتے چلے جائیں گے ، اسی قدر ان کے سامنے زندگی کی ترقی کی راہیں کشادہ ہوتی چلی جائیں گی ، اور ان کو ترقیاتی عروج پورا پورا اس دن نصیب ہوگا جس دن وہ مذہب اسلام کو بالکلیہ خیر باد کہہ دیں گے ، اس کے بعد موصوف اپنے مقالہ میں اسلام کی جگہ لامذہبیت کو اپنانے کی دعوت برابر دیتے چلے گئے ہیں ، مثلاً ایک جگہ علماء اسلام کیطرف سے اسلامی عقاید اور احکام کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" علماء اسلام کا یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو اسلامی دنیا میں سیکولرزم ، لامذہبیت کے پھیلنے کا براہ راست ذمہ دار ہے " صـ۱۶

پھر اسکی مثال کیلئے " شرح زکوٰۃ " کو ملوانہ منطق کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں :-

" واقعہ یہ ہے کہ جدید زندگی اور روایتی اسلام (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اب تک محفوظ چلا آرہا ہے ۔ ناقل) کے درمیان ٹکراؤ کے اس تمام عرصہ میں علماء کی اکثریت کیطرف سے جس نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا رہا ہے ۔ وہ حقیقت میں سیکولرزم کا براہ راست ممد ومعاون ہے " صـ۲۱

ایک جگہ پاکستان میں ، اسلام کی ضرورت سیکولرزم کے فعال اور موثر قوت بننے تک کو بڑی صراحت سے ذکر کرتے ہیں :-

" مزید برآں پاکستان کے دو حصے ہیں ۔ جو جغرافیائی لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں ۔ اور یہ صورت حال ہندوستان تک کو درپیش نہیں ۔ اب جب تک کہ سیکولرزم مثبت ترقی کے لئے ایک فعال اور موثر قوت نہ بنائی جا سکے ، ان ملکوں کے لئے یہی ایک صورت ممکن نظر آتی ہے ، کہ وہ مذہب کو مملکت کی اساس تسلیم کریں " صـ۲۳

ایک جگہ اسلامی مملکت ہونے کی وجہ سے پاکستان کی مشکلات اور اس کے مقابلہ میں

ایک سیکولر مملکت کی آسانیوں کو بڑے للچاتے ہوئے انداز میں ذکر کرتے ہیں :-

"لیکن یہی وہ اصل سوال ہے ، یعنی اسلام کی نئی تعبیر کی دریافت ، جس کا ذہنی سطح پر حل تلاش کرنے میں سرکاری پالیسی مایوس کن رہی ہے ۔ اولاً ہمیں تسلیم کر لینا چاہیئے ۔ کہ اس طرح کے تمام مسائل کے حل ۔ جیسے کہ اقلیتوں کے ساتھ کیا سلوک ہو ، اور صنعتی اور تکنیکی تبدیلی سے جو معاشرتی نتائج نکلیں گے ، ان کے پیش نظر ترقیاتی پروگرام کیا ہوں ۔ ایک سیکولر مملکت میں زیادہ آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں ۔ کیونکہ سیکولرزم تو ہے ہی روایتی رکاوٹوں اور تعصبات سے نجات پانے کے لئے ایک جرات مندانہ قدم ، خواہ اس کے لئے کتنی بھی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے ۔ اب چونکہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے ۔ اس لئے اسے ان مسائل کے حل کرنے کے لئے بڑی مشکلات درپیش ہیں " ص ۲۴

ایک مقام پر ان نام نہاد مشکلات کے حل کے لئے بزعم خود تعبیر و تاویل کا قابلِ قبول طریقہ پیش کیا ہے ، اور اس سلسلہ میں تعدد ازدواج کی بحث کو اٹھا کر حسب عادت اس پر طویل تقریر کی ہے ، جس کا حاصل یہ ہے ، کہ قرآن کا اصل منشا تو یہ ہے کہ عام حالات میں ایک مرد کیلئے ایک بیوی کا ہونا ہی "مثالی حیثیت" رکھتا ہے ۔ مگر زمانۂ نزول کے معاشرے سے اسے مصالحت کرنا تھی اور اس معاشرے میں تعدد ازدواج کی جڑیں گہری تھیں اس لئے اسے قانونی سطح پر تعدد ازدواج کو قبول کرنا پڑا ۔

"تاہم رسولِ مقبول علیہ السلام کی یہ آرزو تھی کہ مسلمان اس مثالی معاشرے کو بتدریج اپنائیں گے ۔ بہرحال تاریخی لحاظ سے ہوا برعکس ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد بڑے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئیں ، جن کے نتیجے میں مسلم معاشرے میں بہت بھاری تعداد میں باہر سے عورتیں اور لونڈیاں ، اور یہ چیز اس معاملے میں قرآن کے اصل مقصد کے لئے رکاوٹ بن گئی " ص ۳۰

آنحضرت صلی اللہ علیہ کیطرف جس آرزو کی نسبت کی گئی ہے ۔ اس کا علم موصوف کو کن ذرائع سے ہوا ۔؟ یہ تو انہیں کو معلوم ہوگا ، لیکن ان کی عبارت سے اتنی بات بہرحال صاف ہو جاتی ہے ۔ کہ ان کے نزدیک قرآن کے مثالی معاشرہ کا جو تصور ہے ، اسے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سکے ، نہ خلفاء راشدین ، نہ صحابہ ، نہ تابعین ، نہ آئمہ مجتہدین ، نہ چودہ سو سالہ امت ، بلکہ موصوف کے بقول یہ تمنائے نبوی کبھی شرمندۂ وقوع نہ ہو سکی ، البتہ تعبیر و تاویل کے جدید تیشے سے چاہا جاتا ہے کہ

قرآن کو تلاش کر کے یہ مثالی معاشرہ قائم کر دیا جاتے۔ غالباً پاکستان میں مسلم فیملی لاز کے ذریعہ پہلی دفعہ آپ کی آرزو کو پورا کرنے کے لئے مارشل لار کی فرصت تلاش کی گئی ـــ سبحان اللہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو کا انکشاف ہوا کس کو ۔ ؟ چودہ سو سال بعد کے ڈاکٹروں کو، جن کے نزدیک اسلام خود ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کے ذیل میں انہوں نے مسئلہ غلامی کا ذکر بھی کیا ہے ـــ فرماتے ہیں:۔

"اور یہی غلامی کے مسئلے میں ہوا۔ جسے قانونی سطح پر تو برداشت کر لیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اخلاقی محرک عمل میں لایا گیا، کہ اسکی وجہ سے یہ ختم ہو جاتی ہے۔ اسلامی تاریخ نے اس مقصد کو بھی ناکام کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے تاریخی وجوہ ہیں" صـ۲۰

تاریخی وجوہ کچھ بھی ہوں، لیکن مذاہب عالم کانفرنس کے بھرے مجمع میں تمام دنیا کے نمائندوں کے سامنے یہ اعلان تو کر ہی دیا، کہ نہ صرف تعدد ازواج اور مسئلہ غلامی بلکہ پورے اسلام کو سمجھنے، اس کے منشا کو اپنانے، اور اسلام کی روح پر عمل کرنے میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اب تک اسلامی تاریخ کی تمام صدیاں ناکام رہیں۔ صحیح اسلام کا سراغ تحقیقات اسلامی کے ادارہ کو ملا ہے۔ ـــ اسی کے متصل آپ نے اسلامی عقائد پر بھی بحث کی ہے، تمہیداً فرماتے ہیں:۔

"ہم نے اب تک جن مثالوں کا انتخاب کیا وہ قانونی و اجتماعی معاملات کی ہیں۔ لیکن عقائد کا دائرہ بھی ان سے کچھ کم نہیں" صـ۲۱

یعنی مسلمانوں کا نہ صرف نظامِ قانون غلط ہے، بلکہ نظامِ عقاید بھی غلط، اس کے بعد اس غلطی کی وضاحت کے لئے آپ ایک عجیب وغریب اصول پیش فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"دنیا کے متعلق جدید آدمی کا جو تصور ہے، باوجود ان تمام اختلافات کے جو اس میں پائے جاتے ہیں، وہ قرونِ وسطیٰ کے نقطۂ نظر اور روایتی طرزِ فکر سے مختلف ہے۔ سند کو مان لینا، اور خوش اعتقادی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، اور یہ سکہ جدید دنیا میں اب چالو نہیں رہا۔ جب آپ سند کو مانتے ہیں، تو اس کا نتیجہ لازماً خوش اعتقادی ہوتا ہے" صـ۲۲

موصوف کا مطلب یہ ہے۔ کہ دینِ اسلام کے تمام اعمال، عبادات اور عقائد کا مدار سند پر ہے۔ اور سند کو مان لینے سے چونکہ خوش اعتقادی کا جن چھو جاتا ہے، اس وجہ سے یہ سکہ جدید دنیا میں چالو نہیں رہا، لہٰذا ثابت ہوا کہ دینِ اسلام کا کوئی عقیدہ، کوئی قانون، اور کوئی عمل "جدید دنیا" میں چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ـــ ہمیں معلوم نہیں کہ موصوف کو کس "جدید آدمی" سے ملاقات

کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے مذہب میں سند اور خوش اعتقادی کا سکہ پھینک دئے جانے کا مستحق ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ سکہ امریکہ، برطانیہ اور روس بلکہ تمام ممالک میں اور تمام حلقوں میں بڑی مقبولیت سے چالو ہے۔ وہ کون سا ملک ہے، جہاں بین الاقوامی سفیروں، عدالتی بیانوں، ماہرین فن کی شہادتوں پر اعتماد نہیں کیا جاتا، دنیا کا وہ کونسا جدید ملک، معاشرہ اور فرد ہے جس کے نزدیک کسی کا کسی کی بات پر اعتماد کرنا اسے سند تسلیم کرنا اور خوش اعتقادی اور پسندیدگی کا اظہار کرنا ناقابلِ معافی جرم ہے۔

ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا، کہ یہ اصول کب سے چل نکلا ہے، کہ جو سکہ دنیا میں چالو نہ رہے۔ خواہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔ اسے باہر پھینک کر "حماقت آمیز دانشمندی" کا مظاہرہ کرو۔ عقل و نقل یہ اصول تو تسلیم کرتی ہے۔ کہ اگر کوئی سکہ واقعی بے قیمت، کھوٹا اور ردی ہو، اسے بڑی خوشی سے پھینک دیجئے، خس کم جہاں پاک۔ لیکن جس سکہ کو چودہ سو سال سے دنیا کی ہر سنجیدہ قوم جانچ پرکھ کر۔ اس کے قیمتی جوہر ہونے کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ اسے محض اس وجہ سے پھینک دینا کہ چند احمق اسے کھوٹا بتلانے لگے ہیں، کیا عقل و خرد کا دیوالیہ نکال دینے کے مترادف نہیں۔؟ پھر جس جدید دنیا کا ذکرِ خیر ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں، کیا اس میں قرآن، نبوتِ محمدیہ، حشر و نشر، حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کا سکہ چالو ہے۔؟ اگر نہیں تو جدید دنیا کی خاطر یہ تمام سکے بھی پھینک دیجئے، (اور موصوف ان سب کو پھینک چکے ہیں) ڈاکٹر صاحب نے بڑی سنجیدگی سے اس فقرہ میں جو خیال آرائی کی ہے۔ اگر ہمیں ان کا اور پرنسٹن یونیورسٹی کے سنجیدہ مذاکرہ کا احترام ملحوظ نہ ہوتا، تو ہمارے نزدیک اس کی حیثیت "دیوانے کی بڑ" اور "بازاری گپ شپ" سے زائد نہیں تھی۔ دیوانہ گفت و ابلہ باد کرد۔

ڈاکٹر صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ کیا وہ اتنا نہیں جانتے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عمومی خور وہی چیزیں رہی ہیں، جن کا سکہ قوموں کی حماقت، بگڑی ہوئی ذہنیت اور مسخ شدہ عقل کی وجہ سے دنیا میں چالو نہیں تھا، اب اگر ان کا یہ اصول صحیح ہو، کہ جدید دنیا میں جس سکہ کی چلت نہ ہو، اسے رد کرنا ہی صحیح عقلیت ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی جانب سے پیش کردہ توحید، رسالت، تصورِ قیامت، بعث بعد الموت، حشر و نشر وغیرہ مسائل جو اس وقت کے چلتے سکوں کے علی الرغم پیش کئے گئے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی سے کیا فتویٰ صادر ہوگا ـــــ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا سکہ فرعونی ماحول میں، ابراہیم علیہ السلام

کے نظریات کا سکہ نمرودی ماحول میں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا سکہ کی اور عربی ماحول میں کب چالو تھا۔؟

اصل قصہ یہ ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے تحقیقاتی ادارہ میں "سوچ و بچار" کا سکہ چالو نہیں۔ اس لئے وہ کسی بات کے کہہ ڈالنے سے پہلے اتنا سوچ لینے کے قائل نہیں، کہ ان کے اس نظریہ کی زد میں کون کون آجائے گا۔

چالو سکے کی بحث چل نکلی تو دل چاہتا ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک گذارش مزید کر دی جائے، وہ یہ کہ ہم تسلیم کئے لیتے ہیں۔ کہ جدید دنیا کی بگڑی ہوئی اور خدا سے باغی انسانیت کے ماحول میں انبیاء علیہم السلام کے مآثر کی "سند" اور ان سے "خوش اعتقادی" کا سکہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کے لئے "پرنسٹن یونیورسٹی" میں مقالہ خوانی نہیں کرتے رہیں گے، سنت بنی آدم ان پر بھی آخر کار جاری ہو کر رہے گی، اور موت کا آہنی چنگل انہیں بھی ایک نہ ایک دن دبوچ کر رہے گا، وہ ہمیں بتلائیں کہ بازار آخرت میں کونسا سکہ چلے گا، کیا پرنسٹن یونیورسٹی میں پڑھے ہوئے "ابن سینا اور راسخ العقیدہ اسلام" اور "اسلام پر تجدد پسندی کے اثرات" قسم کے مقالے ۔۔۔؟ "ایں خیال است و محال است و جنوں" انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہاں اسی "روایتی اسلام" کا سکہ چلے گا جس کے ایک ایک حرف کا مذاق اڑانا ہی ان کے نزدیک تقاضائے "جدید عقلیت" ہے۔ اگر ہماری یہ گذارش بھی ان کے نزدیک "سندی خوش اعتقادی" میں داخل ہو تو قرآن مجید پڑھ دیکھیں، اس کا اعلان آج بھی وہی ہے جو کل تھا:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما	اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ
تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر	کھل چکی اس پر سیدھی راہ، اور چلے سب
سبیل المؤمنین نولہ ما تولیٰ و	مسلمانوں کے رستے کے خلاف تو ہم حوالہ
نصلہ جھنم وساءت مصیرا۔	کریں گے اسکو وہی طرف جو اس نے اختیار
(النساء رکوع ۱۷)	کی، اور ڈالیں گے ہم اسکو دوزخ میں اور

اور وہ بہت بری جگہ پہنچا ۔۔۔ (ترجمہ، حضرت شیخ الہند)

ڈاکٹر صاحب اس آیت کے آئینے میں اپنے اس نظریہ کی، اور اس مقالہ کے دوسرے نظریات کی اور دیگر تمام مقالات کی اصل صورت دیکھ لیں ۔۔۔۔۔۔ الغرض ڈاکٹر صاحب

کا یہ اصول ایک اعجوبہ ہے، اب ذرا سنیئے کہ اس "اعجوبہ" کی زد میں وہ دینِ اسلام کی کن کن چیزوں کو لے آتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اور خوش اعتقادی ہی اصل مورث ہے۔ ہر قسم کے جادو، ٹوٹکے پر یقین کرنے، کرامات پر زور دینے، اور بھونڈی شکل میں روحانی شعبدہ بازی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کو عام طور پر جسطرح پیش کیا جاتا ہے، وہ اسطرح کے توہمات پرستی کی، جس کا قرآن مجید سے کوئی ثبوت نہیں ملتا، ایک مثال ہے" ص ۲۱

صرف وہ کرامات جن کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ ان ہی کی اگر فہرست مرتب کر لی جائے، تو ایک اچھا ضخیم مقالہ تیار ہو سکتا ہے، اور معراجِ نبویؐ کا ذکر قرآنِ مجید، احادیثِ متواترہ جن کے راوی تیس کے قریب صحابہ ہیں، کے علاوہ تاریخ و سیرت کی ہر بڑی چھوٹی کتاب میں اجمالاً یا تفصیلاً موجود ہے۔ اور چودہ سو سالہ امت کا اجماعی عقیدہ ہے۔ اور ضروریاتِ دین میں داخل ہے، مگر ڈاکٹر صاحب کی "توہمات پرستی" کی داد دیجئے، کہ آپ نے کرامت، معجزہ اور معراجِ نبوی ڈانڈے، جادو، ٹوٹکے اور بھونڈی شعبدہ بازی سے جا ملائے۔ رہا یہ سوال کہ پھر یہ اجماعی عقیدہ مسلمانوں میں کہاں سے آیا، اور حدیث، سیرت اور تاریخ کے تمام مآخذ کے علاوہ قرآنِ مجید میں بھی کیسے درج ہو گیا۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ:

"معلوم یہ ہوتا ہے۔ کہ جب مسلمان جزیرۂ عرب سے باہر نکلے اور خاص طور سے عراق میں ان کو عیسائیوں سے سابقہ پڑا، تو انہیں مجبوراً عیسائیوں کے اس اعتقاد کے جواب میں کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے جانے کے بعد آسمان پر اٹھائے گئے تھے، معراج کو جسمانی شکل میں پیش کرنا پڑا" ص ۲۱

چونکہ موصوف کی "جدید دنیا" میں کسی دعویٰ کی دلیل اور سند پیش کرنا خوش اعتقادی کا دوسرا رخ ہے۔ اس لئے اگر آپ یہ سوال اٹھائیں گے، کہ موصوف کو "معلوم یہ ہوتا ہے" کا انکشاف کن ذرائع سے ہوا۔ اور اسکی سند اور دلیل کیا ہے۔؟ تو آپ پھر سے "سندی خوش اعتقادی" میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لئے خیریت اسی میں ہے، کہ اسلامی عقائد کے بارے میں موصوف کے تمام انکشافات آپ بلا چون و چرا تسلیم کرتے جائیں، "سندی خوش اعتقادی" کے عفریت سے نجات کی بس یہی ایک صورت ہے۔ البتہ یہ خطرہ ضرور ہے کہ قرآنِ مجید سے آپ اسراء اور معراجِ نبویؐ کا ذکر نے بیٹھیں گے، لیکن اس سلسلہ میں معراج کا صحیح مفہوم جو موصوف نے

ازراہِ عنایت بیان فرمادیا ہے۔ اسے سن کر اطمینان کر لیجئے، فرماتے ہیں:

"قرآنِ مجید نے کئی جگہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض آفاق گیر روحانی مشاہدات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں آپ کی الوہی شخصیت طبعی حدود سے بلند و بالاتر ہو کر حقیقت اولی کے محیطِ کل سے جا ملتی ہے" ص ۲۱

اس تفسیر میں آپ کو "آفاق گیر روحانی مشاہدات" آپ کی الوہی شخصیت، "طبعی حدود سے اسکی بلندی و برتری"، "حقیقتِ اولی" اور "محیطِ کل" جیسے مبہم، مجہول، اجنبی بلکہ بعض لایعنی الفاظ اور مفہوم ضرور ملیں گے، لیکن معراجِ جسمانی جیسے بالکل واضح، آسان اور عام فہم مسئلہ کی توہمات پرستی سے نجات پانے کے لئے ضروری ہے۔ کہ آپ موصوف کے اسی لایعنی قسم کے لفظی گورکھ دھندے پر ایمان لے آئیں، ورنہ صدرِ ادارۂ تحقیقات کی جانب سے خوش اعتقادی کا فتویٰ موجود ہے۔ کیونکہ یہ "جدید دنیا" ہے۔ یہاں قرونِ وسطیٰ کے سکے اور اصول بدل چکے ہیں —— بریں عقل و دانش بباید گریست۔

موصوف نے توہمات پرستی کو جو شین گن نصب کی ہے، اس کا سارا مسالہ ختم نہیں ہو گیا، ابھی اسکی گولہ باری باقی ہے، ارشاد ہوتا ہے:-

"اسی طرح مسلمانوں کے ہاں شفاعت کے مشہور عام عقیدے نے جو شکل اختیار کی ہے، وہ عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کا جواب تھا" ص ۲۱

بطور خلاصہ آخری بات یہ کہ:-

"غرض قرآنِ مجید کی واضح تعلیمات کے بالکل برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کثیر التعداد معجزات منسوب کر کے آپ میں ایک حد تک شانِ ایزدی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی" ص ۲۱

گویا صرف معراج، کرامت، شفاعت اور معجزات ہی نہیں، یہ تو صرف "ایک مثال" کے بطور ذکر کئے گئے ہیں ورنہ اس اصول کی روشنی میں ان امور کے علاوہ اسلام کے جس جس عقیدہ، عمل، یا مسئلہ کے لئے بھی کسی کا دل چاہے۔ تو "خوش اعتقادی" اور "توہمات پرستی" کا ہلکا سا فقرہ چست کیا جا سکتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ بذریعہ معجزاتِ نبیؐ کو خدا بنانے کا "کامیاب عمل" کس کی ستم ظریفی ہے۔ تمام دنیا کے نمائندوں کی بھری محفل میں اس کا جواب ڈاکٹر صاحب کی زبان سنیئے:

"نبی علیہ السلام کو ایک "اساطیری رنگ" میں پیش کرنے کا یہ عمل جس کا مصدر و منبع ایک سے زیادہ عناصر تھے، "راسخ العقیدہ گروہ" بھی برابر اس میں شریک رہا، اور اسے اس نے قبول کیا" ص ۲۱

"راسخ العقیدہ گروہ" یعنی صحابہ و تابعین سے لیکر آج تک کے تمام علماء و صلحاء "خداسازی" کے اسی شغل میں لگے رہے۔ پوری امت پر "اساطیری رنگ آمیزی" اور "خداسازی" کا الزام اس "اعجوبۂ زمان" کیطرف سے لگایا جارہا ہے، جو اسی مجلس میں اور اسی مقالہ میں چند سطر پہلے سند کو خوش اعتقادی قرار دے اساطیری (بے سند) افسانہ طرازی کرتا ہے، اور "آپ کی الوہی شخصیت" کے بے سروپا دعوے ہانکتا ہے۔ ع چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

پھر کثیر التعداد "معجزات" اور "شانِ ایزدی" پیدا کرنے کی تک بھی عجیب ہے۔ کیا قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے کثیر التعداد و معجزات کا کہیں ذکر نہیں۔؟ کیا قرآن عزیز بھی ان کے بقول "اساطیری رنگ میں خداسازی" کی کامیاب کوشش کرتا رہا۔ خدا جانے ان کو کس نے بتلا دیا ہے کہ اگر نبی کیلئے معجزہ کو تسلیم کرلیا جائے، تو نبی خدا بن جاتا ہے۔ کیا ان کو "معجزہ" کی اتنی حقیقت بھی معلوم نہیں کہ "معجزہ صرف خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، نبی کے فعل کو اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔" البتہ عالم اسباب سے بالاتر کسی چیز کا اس کے ہاتھ پر ظاہر ہونا اس کے دعوائے نبوت اور مامور من اللہ ہونے کی حقانیت کی دلیل ہوتا ہے۔

موصوف نے اسلامی تاریخ کی تیرہ چودہ صدیوں کے تمام علماء کی جس طرح تجہیل و تحمیق اس "مذاہب عالم کانفرنس" میں کی اس کا ایک نمونہ اور ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

"گذشتہ تیرہ صدیوں کے دوران فقہاء یا علمائے اسلام اپنی بحث و نظر میں جن تحقیقاتی نتائج پر پہنچے ہیں، اگرچہ ان کا پوری سنجیدگی و توجہ سے مطالعہ کرنا چاہیئے، اور ان کو قرار واقعی اہمیت دینی چاہیئے، لیکن اس کے باوجود یہ دیکھنے میں آئے گا، کہ اکثر معاملات میں ان کے تحقیقاتی نتائج یا تو صحیح نہ تھے۔ یا وہ اس معاشرے کے لئے موزوں تھے، جس میں وہ رہتے تھے، نہ کہ آج کے معاشرے کیلئے۔" ص ۲۷

تیرہ صدیوں کے فقہاء اور ائمہ اجتہاد کے تحقیقاتی نتائج کا پوری سنجیدگی اور توجہ سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کی قرار واقعی اہمیت اہل نظر کے نزدیک کیا ہوگی۔؟ یہ بحث تو اپنی جگہ رہی، البتہ موصوف کے نزدیک ان کی قرار واقعی اہمیت یہی ہے کہ ع

ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ معاذ اللہ

یعنی ان کے عقائد غلط، ان کی تحقیقات محض رنگ آمیزی، ان کا شعور و فہم قرآن و سنت کے صحیح مطالعہ سے محروم، ان کی تفسیری، حدیثی، اور فقہی تشریحات ناقابل قبول، اہل قرآن، سنت

اور اسلام کا صحیح فہم میکگل یونیورسٹی کے طالب علم اور یہودی پروفیسر اسمتھ کے شاگرد عزیز اور نورِ نظر، اور ان کے اداری رفقاء کو نصیب ہوا۔ ان کے بقول یہی اصل وجہ ہے کہ اس گروہ کو ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کی صورت میں منظم کر کے اسلام کی نوک پلک سنوارنے اور اسے جدید زمانہ، یعنی مذاہبِ عالم اور دیگر نظریہ ہائے حیات سے ہم آہنگ کرنے کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسکی تفصیلی روئداد بھی موصوف نے مذاہبِ عالم کے نمائندوں کے سامنے رکھی، فرماتے ہیں:

"صدر محمد ایوب خاں کی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں ایک ادارہ، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے نام سے علومِ اسلامی میں تحقیقات اور جدید ضرورتوں کے لئے اسلام کی تعبیر و تشریح کی غرض سے قائم کیا، ۱۹۶۲ء میں اس ادارہ کو ایک آئینی حیثیت دی گئی" صـ۲۶

اسی کے ساتھ موصوف نے "اسلامی مشاورتی کونسل" کے قیام، اس کے اغراض و مقاصد، ان دونوں اداروں کے تعلق کی نوعیت کا ذکر کیا، اور ان کے الفاظ میں پہلی آزمائش یعنی مسئلہ سود کے بارے میں "اسلامی مشاورتی کونسل" کے پیش کردہ رویہ پر تنقید کرتے ہوئے اس موقعہ پر "ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی" کی جرأتِ رندانہ کا قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ ذرا الفاظ کی صولت اور شوکت ملاحظہ فرمائیے، ایسا لگتا ہے کہ آپ ابوحنیفہ اور شافعی کی حیثیت سے نہیں بلکہ دنیائے اسلام کی سب سے بڑی اتھارٹی کی پوزیشن میں مصروفِ گویائی ہیں:

"ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے "تحقیقی مطالعہ" نے بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب میں ربا کا جو واقعۃً نظام مروج تھا، وہ انتہائی بھونڈے قسم کے معاشی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا تھا، اس لئے قرآنِ مجید نے بار بار کی تنبیہات کے بعد اسے ممنوع قرار دیا۔ اور یہ کہ بعد کی صدیوں میں مسلمان فقہاء نے غیر ضروری طور پر اس ممانعت کا دائرہ ان تمام مالی معاملات پر کر دیا جن میں کہ اصل رقم پر کچھ اضافہ ہوتا ہو، چنانچہ اس ضمن میں ادارۂ تحقیقات کا استدلال یہ تھا کہ اسلام کو آج بروئے کار لانے کے لئے سب سے پہلے تو یہ لازمی ہے کہ قرآنِ مجید کے احکامات کا تاریخی پس منظر سمجھا جائے، تاکہ اخلاقی، روحانی اور معاشرتی و اقتصادی میدانوں میں قرآنِ مجید کس قسم کی اغراض کی تکمیل چاہتا ہے، ان کا تعین کیا جائے، نیز آج کے سیاق و سباق قرآن کی عملی تطبیق محفوظاً نہیں کی جا سکتی" صـ۲۷

حکومت کے قائم کردہ اس آئینی ادارہ کا یہ نقطۂ نگہ اور طرزِ تعبیر۔ یعنی تیرہ صدیوں کی

تحقیقات کو غلط قرار دینا، اور قرآن کی لفظی تعمیل کو حماقت بتلاکر، اسلام کی آزادانہ تعبیر و تشریح یا بلفظہٖ صحیح تحریف و تبدیل کے بارے میں موصوف فرماتے ہیں:

"یہ طریقہ، سب طریقوں سے جنہیں عام طور پر اب تک اختیار کیا گیا ہے، اس قدر انقلابی اور بنیادی لحاظ سے مختلف ہے۔ کہ یہ نہ صرف فقہ اور سنت نبویؐ کو بلکہ قرآن مجید کے احکامات تک کو بھی تاریخی مطالعہ کا موضوع بتایا ہے، اسے نہ محض "روایت پرست علماء" بلکہ بہت سے تجدد پسند بھی قبول کرنے سے سنجیدگی کے ساتھ تامل ہی کریں گے" صہ ۲۸

مطلب یہ کہ تجدد پسندی کے جتنے طریقوں کا اب تک تجربہ کیا گیا ہے۔ وہ سب جزوی تھے، ان میں اسلام کی بعض چیزوں کو بہرحال تسلیم کر لیا جاتا تھا، لیکن ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے "ذہین کارندوں" نے جو طریقہ درآمد کیا ہے، اس میں فرضی تاریخ کے خیالی افسانوں سے قرآن کے احکام یا بلفظہٖ صحیح خود قرآن کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس کے قبول کرنے کی جسارت لوگوں کو مشکل ہی ہو سکتی ہے۔ ع خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں موصوف نے اس طریقہ تحریف کے قبولیتی امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے:

"اگر ایسا نہ ہوا تو راقم السطور اسلام کا اس کے سوا اور کوئی مستقبل نہیں دیکھتا کہ وہ کچھ عرصے بعد محض چند مذہبی رسوم بن کر رہ جائے گا، جن سے کہ کچھ آنے والے وقت تک لوگوں کی جذباتی وابستگی قائم رہے" صہ ۲۸

موصوف خواہ مخواہ پریشان ہیں، ان سے ہماری گذارش یہ ہے، کہ وہ صرف حکومتِ پاکستان کی مدد سے نہیں، بلکہ اگر ان سے ہو سکے تو امریکہ اور روس اور "وسیع تر جدید دنیا" جس کے غم میں وہ گھل گھل کر کانٹا ہو رہے ہیں، کی مدد سے بھی اسلام کو بدلیں اس کے لئے جس قسم کے نظریات چاہیں اختراع کریں۔ اور جتنے بندوں کو بہکایا جا سکتا ہے بہکائیں۔ واستفزز من استطعت منهم بصوتك واجلب عليهم بخيلك ورجلك وشاركهم في الاموال والاولاد وعدهم وما يعدهم الشيطان الا غروراً۔

الغرض آپ سے جو ہو سکتا ہے کر لیں، لیکن یاد رہے کہ اللہ دین کا حافظ ہے، دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا چلے گا، اور تعبیر و تشریح امام ابوحنیفہ اور شافعیؒ وغیرہم ہی کی چلے گی، آپ اور آپ کے رفقاء آسمان سے سورج اور چاند بھی لاکر رکھ دیں، تب بھی مسلمان آپ لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ شارع تسلیم نہ کریں گے، نہ ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ ماننے کیلئے

تیار ہوں گے۔

یہ اس مقالہ کے چند اقتباسات تھے، موصوف نے اسلامی حکومتوں، بالخصوص حکومتِ پاکستان کے دورخاپن اور منافقت اور متجددین کی بھیڑ میں ذہنی بصیرت کے فقدان اور ان کی مسلسل ناکامیوں کا ذکر بھی بڑی دلسوزی سے کیا ہے، مگر ہم بغرض اختصار انہیں قلم انداز کرتے ہیں۔ البتہ ہمارا خیال ہے۔ کہ موصوف نے اس طویل مقالہ کی نوشت وخواند پر اپنا اور معزز شرکائے کانفرنس کا قیمتی وقت ناحق ضائع کیا، کیونکہ اگر وہ چاہتے تو وہ اس تمام مقالہ کا خلاصہ پیش کر سکتے تھے، مثلاً وہ اتنا لکھ دیتے:

"جناب صدر محترم! و معزز حاضرین کانفرنس! آپ حضرات یہاں اپنے اپنے مذاہب پر مقالات پڑھیں گے، لیکن فقیر بدقسمتی سے جس مذہب کا وکیل بن کر حاضر ہوا ہے۔ اس کا ماضی سیاہ، حال پریشان اور مستقبل خطرناک حد تک تاریک ہے، ماضی کا یہ حال کہ تمام اسلامی عقائد مثلاً معجزہ، کرامت، شفاعت، معراج وغیرہ شروع ہی سے توہم پرستی کا پلندہ ہیں۔ اور اسلامی قانون اور معاشرت کا یہ حال ہے، کہ تعدد ازدواج، مسئلہ غلامی، جزیہ اور اقلیتوں کے حقوق جیسے موٹے موٹے مسائل میں بھی ہمارے تیرہ صدیوں کے علماء قرآنی روح کو سمجھنے، اسے اپنانے اور اسے رنگ آمیزی سے جدا رکھنے سے محروم رہے، اب ان کی کس بات پر اعتماد کر لیا جائے ——— اور اسلام کا حال یہ ہے، کہ موجودہ دور کی تمام مسلم حکومتیں دورخے پن اور منافقت کی شکار ہیں، تجدد پسند بصیرت کے فقدان میں مبتلا ہیں، اور قدامت پسند اپنے طرزِ عمل سے سیکولرزم کے داعی ہیں۔ اس پریشان کن صورتِ حال سے گھبرا کر ہمارے صدرِ محترم نے اسلام کو تعبیر و تاویل اور تحریف و ترمیم کے ذریعے زمانۂ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کی تنظیم میں فقیر اور فقیر کے ہم مسلک رفقاء کو مامور فرمایا ہے۔ ہم نے اس "انقلابی تعبیر" کا ذریعہ بھی تلاش کر لیا ہے۔ لیکن خدشہ یہ ہے۔ کہ قدیم و جدید دونوں حلقوں کی جانب سے اسکی مخالفت کی جائے گی، اسلئے اے شرکائے کانفرنس! خدارا دنیا بھر کے مسلمانوں سے اپیل کرو کہ وہ ہماری ان بری بھلی تحقیقوں کو بہر حال قبول کر لیں ورنہ اسلام کا مستقبل خطرہ میں ہے۔"

بتلائیے! کیا اس خلاصہ میں تمام مقالہ نہیں آگیا۔؟ مدبر فکر و نظر راوی ہیں۔ دروغ بر گردنِ راوی، کہ اس مذاکرہ میں ایک مقالہ چینی مذاہب پر پڑھا گیا، ڈاکٹر فضل الرحمٰن اس مقالہ پر تبصرہ کرتے

والوں کے بورڈ کے ایک رکن تھے، چینی مذاہب کے ضمن میں چین کے موجودہ کمیونزم کا بھی ذکر آیا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر فضل الرحمان نے چینی کمیونزم کے بارے میں کہا کہ آج یہ تمام مذاہب کے لئے سب سے بڑا اور کامیاب چیلنج ہے۔" مدیر فکر و نظر بیچارے سیدھے آدمی ہیں، ڈرتے ڈرتے چبا چبا کر بات کرتے ہیں۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کو اسلام سے جس قسم کی عقیدت اور وابستگی ہے، جس کا اظہار اسی مقالہ کے مندرجات سے بخوبی ہو جاتا ہے، اسے سامنے رکھیئے تو اسلام کے مقابلہ میں ڈاکٹر صاحب چینی کمیونزم کو کیا، بھارت کے سکھ ازم اور سیکولرزم کو بھی بڑی آسانی سے "سب سے بڑا اور کامیاب چیلنج" قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں بھی مشکلات بہرحال اتنی نہیں جتنی ڈاکٹر صاحب کو اسلام میں پیش آرہی ہیں۔ کیونکہ نہ ہو، ڈاکٹر صاحب جیسے ذہین آدمی کو اپنے مذہب کی اتنی ہی کامیاب وکالت کرنی چاہیئے تھی۔

گر بہ میرد سگ وزیر موش را دیوان کنند
ایں چنیں ارکانِ دولت ملک را ویران کنند

——— بقیہ، دیارِ عرب ———

مشغول تھے۔ امام غزالی روئے اور فرمایا کہ افسوس علم پر ایسا زوال آیا کہ بیت المقدس میں درس کے صرف دو تین حلقے پائے جاتے ہیں۔ امام غزالی نے اپنے وقت میں دو صد حلقہائے درس کو کم سمجھا اور روئے، اور آج صحیح معنوں میں ایک بھی حلقہ درس یہاں نظر نہیں آتا۔ لیکن دین کی اس حالتِ زار پر کوئی رونے والا نہیں ہے۔

جمعہ کی نماز ہم نے مسجد اقصیٰ میں پڑھی۔ خطیب نے خطبہ میں شاہ حسین کی درازیٔ عمر اور بقاء سلطنت کے لئے دعائیں مانگیں اور مؤذن نے باآوازِ بلند آمین کہا ——— یہ دعائیں سن کر یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم اس قدیم زمانے میں ہیں جس میں بادشاہِ وقت کی درازیٔ عمر اور بقاء سلطنت کے لئے دعائیں مانگنا جمعہ کے خطبوں کا جزو لاینفک تھا۔

جمعہ کی نماز کے بعد مصطفیٰ ابوطیر صاحب سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ یہ قدس کے قریب "صور باھر" نامی بستی کے باشندہ ہیں۔ اور جامعہ میں ہمارے ساتھی رہ چکے ہیں۔ ان کی معیت میں ہم نے حرم کے بعض مقدسات دوبارہ دیکھے۔ مسجد اقصیٰ کی بعض تفصیلات جو ہم معلوم نہیں کر سکے تھے انہوں نے بتلا دیں۔ چنانچہ اقصیٰ قدیم، محراب زکریا، جامع عمر، اور جدار براق وغیرہ کی نشاندہی انہوں نے ہی کر دی۔ ابوطیر صاحب یہ وعدہ کر کے چلے گئے کہ کل آکر وہ ہمیں خلیل الرحمن اور بعض دوسرے مقامات کی زیارت کرائیں گے ——— (باقی آئندہ)